آخری قسط

اُسوۂ حسینی

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

میدانِ جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب تھے جو آرہے تھے۔ اور وہ کوہِ عزم و استقلال تھا جس سے ٹکرا کر وہ خود پاش پاش ہوجاتے تھے۔ مجھے دلدوز واقعات کا تذکرہ منظور نہیں۔ وہ ہر شخص کے دل پر لکھے ہوئے ہیں اور ہر شخص کے سامنے پیش نظر ہیں۔

گویا ان تمام مصائب کے ہجوم میں ان سخت سے سخت تکالیف میں حسینؑ کی زبان تھی اور اس پر یہ کلمہ جاری تھا۔

ان کان دین محمد لم یستقم

الا بقتلی یا سیوف خذینی

''اگر میرے ناناؐ کا مذہب اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک میری رگِ حیات قطع اور میری زندگی ختم نہ ہوجائے تو اے خون آشام تلوارو آؤ۔ یہ جسم تمہارے لئے موجود ہے اسے لے لو۔''

واقعات سخت سے سخت ہوتے جاتے تھے۔ اصحاب برابر نصرت کرتے رہے، امامؑ کی حمایت کا جو حق تھا ادا کردیا۔ دنیا میں ایسے ثباتِ قدم کا نمونہ اور ایسے استقلال کا مظاہرہ آج تک نہیں ہوا ہے۔ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تیس ہزار آدمی ایک طرف اور بہتر آدمی ایک طرف اور اس پر جس ثبات واستقلال کے ساتھ انھوں نے جنگ کی ہے جس طرح اطمینانِ قلب کے ساتھ خوش خوش چہروں کے ساتھ، بشاش بشروں کے ساتھ قائم رہے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ انھیں یہ احساس تھا کہ ہم زخم نہیں کھا رہے ہیں بلکہ ہم خود زندہ ہو رہے ہیں اور مذہب کو زندہ کر رہے ہیں۔ اس لئے وہ خوش تھے انھیں کوئی اضطراب نہ تھا۔

امام حسینؑ خیمہ کے اندر ہیں اور عبدالرحمٰنؓ بن عبد ربہّ انصاری اور بریر بن خضیرؓ ہمدانی دروازہ پر بیٹھے ہیں اور بریرؓ عبدالرحمٰنؓ کے ساتھ کچھ مذاق کرتے ہیں۔ عبدالرحمن بگڑ کر کہتے ہیں۔ **دعنا فواللہ ماھذہ بساعۃ باطل**''۔ چپ رہو! یہ گھڑی ایسی باتوں کی نہیں ہے''۔ (چونکہ مذاق عام طور پر حقیقت سے الگ ہوتا ہے، اس لئے اسے عام محاورہ میں ''باطل'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) بریر نے کہا:

''خدا کی قسم میرے قبیلہ کے تمام آدمی جانتے ہیں کہ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کبھی میری طبیعت میں مذاق نہیں رہا۔ مگر عبدالرحمٰن! اس وقت سے بڑھ کر اور کون وقت خوشی کا ہوگا۔ بس ایک تھوڑی دیر تک دو دو ہاتھ دشمن سے جنگ کرنا ہے اور پھر جنت میں پہنچ جانا ہے مجھے تو جتنی دیر ہوتی ہے وہ طبیعت پر گراں ہے اور دل چاہتا ہے کہ کہیں جلدی سے دشمن کی تلواریں ہم پر برس پڑیں اور ہمارا کام تمام کردیں'' (۱)

کیا کہنا ان اصحاب کی شجاعت کا۔

کیا کہنا ان کی پُرجگری کا۔

عابس بن ابی شبیب شاکری میدانِ جنگ میں آتے ہیں ''الا رجل''، ''الا رجل'' کیا کوئی مرد نہیں ہے جو میرے مقابلہ کو نکلے''؟

لشکرِ عمر سعد پر خوف طاری ہوجاتا ہے۔ آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ **ھٰذا اسد الاسود ھٰذا ابن ابی شبیب لا یخرجنّ الیہ احد منکم**۔ ''یہ شیروں کا شیر، یہ عابس بن ابی شبیب ہے، جو اس کے مقابلہ کو جائے گا جان سلامت واپس نہ لائے گا۔''

---

(۱) طبری، ج ۶، ص ۲۴۱۔

عمر سعد کا حکم ہوتا ہے پتھروں کی بارش کردو (کیا کہنا اس اصولِ جنگ کا) بہادروں کا، مقابلہ اس صورت سے کرنا عرب کی بہادری کے لئے ننگ رہے گا)۔

ہرطرف سے پتھروں کا مینہ برسا، عابس نے زرہ اتار کر پھینک دی، مغفر اتار کر پٹک دیا، اور اسی طرح دشمن کی فوج میں ڈوب گئے۔

یہ ہے شجاعت، اس کا نام ہے جان نثاری، وہ اپنی اس محدود زندگی کو زندگی نہ سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کو ایک لامحدود زندگی حاصل کرنا ہے جہاں تک ممکن ہو اس زندگی کو جلد حاصل کرلیں۔

ایک وہ وقت آیا کہ اصحاب میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ اعزّا بھی شہید ہو چکے کوئی نہیں، حسینؑ ہیں اور دشمن کا لشکر چاروں طرف سے ہجوم ہے۔ حملوں پر حملے ہیں۔

بے شک حسینؑ ہیں اور ثباتِ قدم، استقلال ہے اور پا مردی، بات پر قائم رہنا ہے اور حمایتِ حق، باطل سے علٰیحدگی ہے اور نصرت مذہب۔

اب جنگ کو دیر گزر چکی ہے، واقعات سخت تر ہوتے جاتے ہیں۔ مصائب کا تذکرہ مجھے منظور نہیں۔ وہ آپ سنا ہی کرتے ہیں۔ مجھے وہی چیزیں بیان کرنا ہیں جن کا میرے موضوعِ بیان سے تعلق ہے۔

فوج عمر سعد کا ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ ''**واللہ ما رأیت مکسور اقط قد قتل ولدہ و اھل بیتہ و اصحابہ اربط جاشا ولا امضیٰ جنانا منہ ولا اجرأ مقدما واللہ ما رأیت قبلہ ولا بعدہ مثلہ**''۔

''خدا کی قسم، میں نے کوئی دل شکستہ وزخم رسیدہ آدمی جس کے اولاد، بھائی اعزّا، انصار، سب قتل ہو گئے ہوں۔ ایسا نہیں دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن، مستقل مزاج، ثابت قدم اور باہمت ہو۔ خدا کی قسم ان سے زیادہ کیا میں نے ان کے قبل اور ان کے بعد، ان کے مثل بھی کوئی نہیں دیکھا۔''(۱)

اس عزم واستقلال کے ساتھ دنیا کو یہ سبق دے رہے تھے کہ دیکھو حق پر ہو تو جان دینے میں مضائقہ نہ کرو۔ ہر چیز کے مقابلہ میں جان عزیز رکھو۔ مگر عزتِ مذہب اور ناموسِ دین ایسی چیز نہیں ہے جس کے مقابلہ میں جان عزیز کی جائے۔

آپ کا نعرہ شیرانہ ہے جو کربلا کی فضا میں آپ کے دہن سے نکل کر گونجا اور پھر فنا نہیں ہو گیا۔ وہ مردہ قوموں میں حیات پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ ایک جملہ ہے جو کربلا میں آپ کی زبان پر تھا۔ ''**الموت اولیٰ من رکوب العار**'' موت عاروننگ کے برداشت کرنے سے بہتر ہے۔'' یہ وہ کلمہ ہے جو حیاتِ قومی کا سرنامہ قرار پانے کے قابل ہے۔(۲)

حسینؑ نے حق کے لئے کسی چیز کو عزیز نہیں کیا۔ اصحاب کو اپنے سامنے رخصت کیا۔ اولاد کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا۔ ہوسکتا تھا کہ حسینؑ سب سے پہلے ہی لڑتے اور شہید ہو جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ اصحاب آپ کو روکتے اور گوارا نہ کرتے مگر یہ بھی تو کہیں تاریخ میں نہیں ہے کہ آپ نے چاہا ہو، پہلے خود شہید ہو جائیں، پہلے خود ہی دشمنوں کے تیغ و نیزہ و خنجر کا نشانہ قرار پائیں۔

آپ نے یہ نہیں چاہا۔ سب کو اجازت دے دی۔ عزیز سے عزیز جگر کے ٹکڑوں کو خوشی خوشی اجازت دی۔

بات کیا تھی؟ حسینؑ چاہتے تھے کہ جو کچھ بھی مجھ سے تعلق رکھتا ہے، جو کچھ میری طرف منسوب ہوسکتا ہے۔ جو کچھ میرے خزانہ میں ہے، اس کو اپنے ہاتھ سے لٹا دوں، سب کو اسلام پر نثار کردوں۔ جب کچھ نہ رہے تو اپنی جان دے دینا تو آسان ہے یہ مرحلہ ختم ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔

---

(۱) طبری، ج۶، ص ۲۵۹۔

(۲) یہ اور اس کے بعد کا مضمون تفصیل سے رسالہ ''حسینؑ اور اسلام'' میں درج ہے جو امامیہ مشن پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

نفس کی کمزوری ہوتی اگر آپ اپنی زندگی ختم کرنے پر پہلے ہی تیار ہوجاتے، نہیں یہ تحمّل تھا، یہ قوت برداشت تھی، یہ صبر تھا، کہ چاہتے تھے سب کو میں اپنے ہاتھ سے نثار کردوں، ساتھیوں کی مفارقت برداشت کروں، عزیزوں کی جدائی کا تحمل کروں، بھائی بیٹے اور اولاد سب کو اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں قربان کردوں۔

سب کے متعلق تو میں مجازاً کہتا ہوں کہ حضرتؑ نے اپنے ہاتھ سے اسلام پر فدا کیا۔ مگر وہ شہید جو خود میدانِ جنگ میں آنے کے قابل نہ تھا۔ اسے حقیقتاً اپنے ہاتھ سے لاکر فدیۂ اسلام کیا۔

جب سب کو اسلام کی نصرت میں نثار کردیا تو اس کے بعد اپنی نوبت آئی۔ اپنے اعضاء و جوارح تیغ و خنجر کے حوالہ کئے، اپنا خون اسلام کی نذر کیا۔ جسم کے تمام حصّے اس طرح نصرتِ دین میں صرف کئے کہ ایک ایک زخم پر کئی کئی زخم پڑ گئے۔

جب کچھ نہ باقی رہا اس وقت وہ روح و بدن کا اتصال، وہ آخری علاقہ جس پر نفس کی آمد و شد کا انحصار، زندگی کا دارومدار ہے، اپنا سر بھی راہِ خدا میں پیش کردیا۔

حسینؑ اپنی قربانی کے تمام مراتب منظم صورت سے انجام دے رہے تھے اگر یہ پہلا ہی مرحلہ ابتدائی منزل میں قطع کردیتے، کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دے دی۔ لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کے منازل کو طے کیا۔ تاکہ یہ کہنے کو نہ ہو۔ آپ نے ثابت کردیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ عقل و تدبر پر مبنی اور کامل صبر و سکون کے ساتھ مکمل نظم و ترتیب کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ بالا واقعات کا نتیجہ یا اس سبق کا خلاصہ

موجودہ زمانہ میں اگر قومی حالت پر نظر کی جائے۔ اگر افراد کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوم کی ایک بہت بڑی کمزوری اور ایک بہت بڑا مرض یہ ہے کہ قومیت کا صحیح احساس نہیں۔ غیروں کے ساتھ تو درکنار اپنوں کے ساتھ بھی رواداری کے جذبات فنا ہوگئے ہیں۔ یہ افتراق۔ یہ اختلاف، روز مرہ کی لڑائیاں، روز مرہ کے تنازعات جن سے کوئی جماعت مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ کاہے کا نتیجہ ہیں؟ یہ صرف رواداری نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک اپنے اغراض و مفاد کے سامنے دوسرے کے اغراض کو پامال کردینے کے لئے تیار۔ اپنے مطلب کے لئے ہر ایک کو نقصان پہنچانے پر آمادہ یہ خودغرضی، یہ مطلب پروری جس سے افراد کے درمیان محبت کے جذبات کمزور اور قومیت کا شیرازہ روز بروز زیادہ منتشر ہوتا جاتا ہے۔

اس کے بعد جوشِ عمل باقی نہیں رہا۔ ایک طرف رواداری مفقود، دوسری طرف جوشِ عمل مفقود، رواداری نہیں، اس لئے لڑیں گے۔ دوسرے کی ترقی و بہبودی میں روڑے اٹکائیں گے۔ خود جوشِ عمل نہیں اس لئے اپنی ترقی و بہبودی کا کوئی سامان نہ کریں گے۔ کاش جوشِ عمل کی کمزوری کے پردہ ہی میں رواداری پیدا ہوئی ہوتی۔ لیکن ایسا بھی نہیں۔ اس لئے نہ کوئی انفرادی ترقی حاصل ہوتی ہے نہ اجتماعی۔ انفرادی اس لئے نہیں کہ وہ قوتِ عمل پر موقوف ہے اور اجتماعی اس لئے نہیں کہ وہ شیرازۂ قومی کے اجتماع پر مبنی ہے جو رواداری پر موقوف، آئین پسندی جس بات کو حق سمجھ لینا اس پر مرمٹنا۔ یہ چیزیں وہ ہیں جو ارتقائے قومی کا حقیقی رمز ہیں مگر جوش اور قوتِ عمل کے کمزور ہونے سے یہ جوہر بھی کمزور ہوجاتے ہیں۔ ثابت قدمی باقی نہیں رہتی۔ استقامت کا وجود نہیں رہتا، استقلال کا پتہ نہیں ملتا۔ دعاوی رہتے ہیں جن کا ثبوت مفقود ہوجاتا ہے اگر واقعہ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرلے، اگر حقیقۃً سیدالشہداؑء نے کربلا میں جو اسوۂ حسنہ پیش کیا اس کو اتنا سمجھ

لے کہ اس پر عمل پیرا ہو سکے تو قوم میں زندگی کے آثار نمایاں ہوجائیں۔قوم میں تمام وہ خصوصیات پیدا ہو جائیں جو ایک قوم کے حقیقی ارتقاء کا جزوِاعظم ہیں۔

بات کی صفائی اور حقیقت کا اعلان

دنیا کے سیاست اندیش اور قیادت پسند افراد جب کسی تحریک کے داعی ہوتے ہیں اور کسی چیز کے محرک تو وہ ان لوگوں کو جنھیں ساتھ لینا چاہتے ہیں۔طرح طرح کے مواعید سے اپنی حمایت پر آمادہ کرتے اور طرح طرح کے خوش آیند توقعات پیدا کر کے ان کے خواہشات کو جذب کرتے ہیں اور انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔فتح وظفر کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں، مال و دولت، جاہ و ثروت کے خواب دکھلائے جاتے ہیں۔اس طرح اپنے ساتھ لوگوں کو فراہم کیا جاتا ہے اور ان کی ہمتیں بڑھائی جاتی ہیں۔

اپنی کمزوریاں، مایوسیاں، ناامیدیاں ان اشخاص سے مخفی رکھی جاتی ہیں کہ جن سے کام لینا منظور ہے۔چہ جائیکہ یہ کہنا۔"تم ہمارا ساتھ چھوڑ دو، تم ہمارے پاس سے چلے جاؤ، ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری وجہ سے اپنی جان دو۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ضمیر کی سچائی اور انسان کی ایمانداری و دیانتداری پر بڑا حرف آتا ہے۔اس امر سے کہ وہ کسی کو دھوکے میں مبتلا رکھے اور ایک سچے داعیٔ مذہب اور حقیقی رہنما کے لئے ننگ و عار ہے کہ وہ دوسروں کو غلط توقعات قائم کر کے اپنے ساتھ شریک کرے یا کم از کم خاموش رہ کر ان کو عرصہ تک غلط فہمی میں مبتلا رہنے دے۔

امام حسینؑ نے شروع سے آخر تک اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو اور غلط توقعات کی بناء پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو۔

صرف آخری وقت میں نہیں بلکہ شروع سے! اس وقت جبکہ ظاہری اسباب کی بناء پر آپ کی دنیاوی کامیابی کی توقع بہت قوی ہو سکتی تھی، اسی وقت سے آپ نے اس امر کی کوشش کی کہ کسی کو غلط فہمی نہ پیدا ہو اور ان ظاہری اسباب سے جو توقعات پیدا ہوتے ہیں ان پر بھروسہ کر کے کوئی ہمارے ساتھ نہ آئے اس لئے آپ برابر حقیقتِ حال سے اور اپنے آخری انجام سے مطلع کرتے رہے اور اعلان فرماتے رہے کہ ہمارا آخری نتیجہ اس سفر میں موت ہے۔

اس وقت جب آپ ابھی مدینہ منورہ سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے، اغیار آپ کے ساتھ نہ ہوئے تھے اور خاص اعزا کی جماعت آپ کے ساتھ چلنے پر آمادہ تھی۔اس وقت آپ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خود بخود موت کے استقبال کی تیاری کا پتہ چلتا تھا۔

چنانچہ ابوسعد مقبری جو رجب ۶۰ھ میں جب امام حسینؑ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے ہیں، وہاں موجود تھے۔ناقل ہیں کہ میں نے امام حسینؑ کو دیکھا کہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لئے جارہے ہیں اور دو آدمی دو طرف سے آپ کے بازو تھامے ہوئے ہیں اور آپ ابن مفرغ شاعر کے اس قول کو بطور تمثیل پڑھ رہے ہیں:

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح
صغیر اولا دعیت یزیدا
یوم اعطی من المهایة ضیما
والمنایا بر صدتنی ان احیدا

شاعر نے اپنا نام نظم کیا ہے لیکن آپ کی زبان سے شعر کا مطلب یہ ہے کہ "میرا نام حسینؑ نہیں اگر موت کے خوف سے میں ذلّت کو برداشت کروں اور اس وقت کہ جب موت میری تاک میں ہے میں ہٹ جاؤں۔"

یہ کوئی تقریر نہیں تھی اور نہ کوئی خاص اعلان تھا، مگر سننے والے نے سمجھ لیا اور وہ بیان کرتا ہے کہ "فقلت فی نفسی واللہ ماتمثل بھذین النبیئ الاّ بشیئ یرید۔

''ان اشعار کو سنتے ہی میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدا کی قسم ان شعروں کا پڑھنا رمز سے خالی نہیں ہے اور کوئی مقصد آپ کے پیش نظر ہے جبھی یہ شعر اس وقت پڑھ رہے ہیں۔''
اس کے بعد دو دن نہ گزرے تھے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے(۱)

اب وہ وقت آیا ہے کہ آپ مکہ معظّمہ سے روانہ ہونے والے ہیں یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کو بہت خوش آئند توقعات آپ کے متعلق قائم ہو چکے ہیں اس لئے کہ کوفہ عراق کا پایہ تخت اور بڑا مرکز ہے امیر المومنینؑ کا دارالسلطنت رہ چکا ہے اور لوگوں کی نظر میں علیؑ اور اولادِ علیؑ کے دوستوں سے پُر ہے، وہاں سے بارہ سو ۱۲۰۰ نامے آچکے ہیں کہ آپ آیئے اور ہم آپ کی نصرت میں اپنا خون پسینہ کی طرح بہانے کے لئے تیار ہیں۔ ان خطوط کے بعد حضرت مسلمؑ روانہ کیے جا چکے ہیں، ان کا خط آچکا ہے، کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے ان سب باتوں کے بعد امام حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں تو عام افراد کا خیال اس سفر کے متعلق کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں تاج و تخت کے مالک ہوں گے اور بادشاہ تسلیم کیے جائیں گے۔ اس لئے قدرتاً آپ کے ساتھ بہت سے لوگوں کو اس خیال سے ہو جانا چاہیے تھا کہ وہاں جا کر آپ کی سلطنت سے فائدہ اٹھائیں اور نیز چونکہ آپ زرخیز زمین پر جا رہے ہیں، اس لئے وہاں جا کر مالی منافع بھی حاصل کریں۔

اس طرح یقیناً آپ جو کوفہ کی طرف تشریف لے جاتے تو ایک کثیر جماعت جو ایک لشکر کی حیثیت رکھتی ہوتی آپ کے ساتھ ہوتی اور یقیناً شروع شروع تو اگر جنگ کا موقع ہوتا وہ فتح کے توقعات میں آپ کے ساتھ جنگ میں بھی شریک ہوتی۔ لیکن یہ آپ کو منظور نہ تھا۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو واضح فرما دیں اور سب کو بتلا دیں کہ ان کے خوش آیند توقعات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے مکہ معظّمہ سے روانگی کے ایک دن قبل عام مجمع میں تقریر فرمائی۔ جس میں بعد حمد و صلوٰۃ کے حسب ذیل الفاظ ارشاد کئے تھے۔

''خط الموت علی ولد آدم مخطّ القلادۃ علیٰ جید الفتاۃ وما اولھنی الیٰ اسلافی اشتیاق یعقوب الیٰ یوسف وخیر لی مصرع انا الا فیہ کافی انظر یا وھمالی تقطعھا علان الفلوات بین النوادلیس وکربلاء فیملئن منی اکراشا جوفا واجربۃ سغبا لا محیص عن یوم خط بالقلم رضا اللہ رضانا اھل البیت فصبر علیٰ بلائہ توفینا اجر الصابرین لن تشد عن رسول اللہ لحمیتہ بل ھی مجموعۃ لہ فی خطیرۃ القدس تقریھم عینہ وینجزبھم وعدہ من کان باذلا فینا مھجتہ وموطنا علیٰ لقاء اللہ فلیرحل معنا فانی راحل مصبحا انشاءاللہ''

''موت اولادِ آدمؑ کے گلے کا ہار ہے میں کتنا اپنے اسلاف کی ملاقات کا مشتاق ہوں، اتنا، جتنا یعقوبؑ، یوسفؑ کی ملاقات کے مشتاق تھے میرے لئے بہتر سے بہتر وہ جگہ ہوگی جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں۔ (یہ خبریں تھیں جو سینہ بسینہ رسولؐ سے پہنچی تھیں، جن کی بنیاد پر آپ اپنے مستقبل کی خبر دے رہے تھے) میرے پیش نظر ہے وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے، مقام نوادیس اور کربلا کے درمیان میں وہ مجھ سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے اور اپنی حسرتیں میرے قتل سے نکال رہے ہوں گے، کوئی چارہ کار نہیں ہے کوئی مفر نہیں ہے اس دن سے جو قلمِ تقدیر نے لکھ دیا ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو اسی میں ہم اہلِ بیتؑ کی مرضی ہے۔ ہم اس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور جو صابرین کا اجر ہے اس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں۔ رسالت مآبؐ سے ان

---

(۱) طبری، ج،٦، ص۱۹۱۔

کے جگر کے ٹکڑے دور تھوڑی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ وہ بارگاہِ قدس میں جنتِ اعلیٰ میں ان کے پاس مجتمع ہونے والے ہیں جس سے ان کی آنکھیں خنک ہوں گی، ان کا وعدہ پورا ہوگا، جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔''

دیکھئے ان الفاظ کے ساتھ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی جا رہی ہے کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں حقانیت اور سچائی کا ثبوت ہوگا؟ کیا اس سے بڑھ کر صاف گوئی طہارتِ ضمیر کا مظاہرہ ہوگا؟

اب ساتھ چلنے والے وہی لوگ تھے جو جان دینے کے اوپر تیار تھے، جو حقیقتاً استقلال اور ثابت قدمی رکھتے تھے، جن کو دنیا کی کوئی توقع اور راحت دنیا کا کوئی خیال اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ حقیقت کے طالب تھے، اور مجاز کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس حقیقت پرور تقریر کے بعد وہی لوگ آپ کے ساتھ ہوئے جو دنیا کے مال و دولت، جاہ و حشم کو خاک سیاہ سمجھتے تھے۔ جو زندگی کے طالب تھے اور اسے موت کا نتیجہ سمجھتے تھے، بس وہی آپ کے ساتھ روانہ ہوئے، منتخب مجمع چھٹے ہوئے لوگ، یہ طریقہ تھا امامؑ کے انتخاب کا اور اس طرح آپ نے چاہا تھا کہ حشو و زوائد آپ کے ساتھ نہ ہونے پائیں، وہی آئیں جو موت کے والہ و شیفتہ ہوں۔

یہ تقریر مکہ معظّمہ کی تھی جس نے ہر قسم کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک کر دیا اور حقیقت حال واضح کر دی۔ مگر مکہ معظّمہ سے روانگی کے بعد راستہ کے اعراب، بادیہ نشین قبائل، بے خبر اشخاص، خالی الذہن افراد امامؑ کو دیکھتے ہیں کہ ایک جمعیت کے ساتھ ایک بڑے قافلہ کی شان سے جا رہے ہیں، دریافت کرتے ہیں۔ ''کہاں جا رہے ہیں۔'' معلوم ہوتا ہے عراق وہاں سے طلبی ہوئی ہے۔'' لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظّمہ سے ساتھ آنے والی جماعت مختصر تھی مگر راستہ میں طرح طرح کے لوگ شریک ہونے لگے اور وہ جمعیت جو اس کے قبل ایک قافلہ کی حیثیت رکھتی تھی اب ایک لشکر کی صورت میں آ گئی، کوئی اور ہوتا تو اس فوج کو غنیمت سمجھتا اس لشکر کے اپنے ساتھ ہو جانے کو بہترین موقع خیال کرتا، وہ چاہتا کہ کسی طرح انھیں اپنے ساتھ گرویدہ رکھے اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے۔ ابھی تک امام حسین علیہ السلام بھی خاموش تھے، مجمع بڑھتا جاتا تھا۔ ہر منزل پر کچھ نہ کچھ نئے لوگ آ کر شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ جب عراق کے حدود میں پہنچے اور منزل زرودؔ پر قافلہ پہنچا۔ عبداللہ ابن سلیم اور منذر ابن مشمعل اسدی نے جو مکہ معظّمہ سے آ کر قافلہ سے ملحق ہوئے تھے ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا۔ امامؑ کی بھی نظر اس پر پڑی اور ٹھہر کر یہ چاہا کہ کچھ حالات کوفہ کے اس سے دریافت کریں۔ لیکن اس نے یہ دیکھ کر راستہ بدل دیا اور دوسری طرف روانہ ہوا۔ امامؑ اس کے بعد آگے بڑھ گئے مگر عبداللہ اور منذر نے قافلہ سے الگ ہو کر اس شخص سے ملاقات کی اور اس سے کوفہ کے حالات دریافت کیے۔ اس نے بیان کیا کہ میں کوفہ سے اس وقت چلا ہوں جب مسلم بن عقیلؑ اور ہانی ابن عروہ قتل ہو چکے تھے۔ یہ دونوں آدمی حالت معلوم کر کے واپس آئے۔ شام کا وقت تھا۔ رات بھر انھوں نے یہ بات دل میں رکھی۔ صبح کو جب امامؑ اپنے مخصوص احباب کے مجمع میں تشریف فرما تھے تو دونوں آدمی حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ''ہمیں کچھ عرض کرنا ہے، ارشاد ہو تو ان لوگوں کے سامنے عرض کریں اور اگر حکم ہو تو علیحدہ حضرت نے ایک نظر ان اصحاب پر ڈالی جو اس وقت موجود تھے اور فرمایا: **مادون ھولاء سر** ''ان لوگوں سے راز کی بات کیا ہوگی؟'' دونوں شخصوں نے عرض کیا۔ آپ نے اس سوار کو ملاحظہ فرمایا

تھا جو کل شام کو کوفہ کی طرف سے آ رہا تھا؟ حضرتؑ نے فرمایا۔ ''ہاں اور میں نے چاہا بھی تھا کہ اس سے کچھ حالات دریافت کروں۔'' انھوں نے عرض کیا ہم نے حضور کا منشاء پورا کر دیا وہ ہمارے ہی قبیلہ کا ایک شخص ہے۔ قابل اطمینان اور معتبر، اس نے یہ بیان کیا کہ مسلمؑ ابن عقیلؑ اور ہانی ابن عروہ شہید ہو گئے اور ان کی لاشیں بازار میں پھرائی گئیں۔ امام علیہ السلام نے یہ سن کر بس چند مرتبہ ''**انا للہ و انا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیھا**'' کا کلمہ زبان پر جاری فرمایا اور خاموش ہو گئے۔

یہ دونوں آدمی جو شب بھر اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس سے کافی اثر لے چکے تھے اور تمام صورتِ حال پر غور کر چکے تھے کہ کوفہ جانا اب بیکار ہے اور کوئی امید کوفہ میں باقی نہیں ہے۔ انھوں نے بے تاب ہو کر کہا ''**ننشدک اللہ فی نفسک و اھل بیتک الا انصرفت من مکانک ھذا فانّہ لیس لک بالکوفۃ ناصر و لا شیعۃ بل نتخوف ان تکون علیک**''۔

''ہم حضور کو خدا کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ بس یہیں سے واپس چلیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ دوست بلکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی ناگوار صورت پیش نہ آئے۔''

حضرت نے مناسب وقت جواب دے کر ان لوگوں کی تسلّی کر دی اور پھر خاموشی اختیار فرمالی۔

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً جیسا امامؑ نے مجمع کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ ''ان لوگوں سے کوئی راز کی بات راز نہیں ہے۔'' تو وہ جماعت تھی ہی ایسی راز دار وامانتدار کہ ایسی عظیم خبر کی اطلاع ہوئی اور اس مجمع میں بیان کی گئی مگر پھر بھی عام اہلِ قافلہ سے وہ راز ہی کی صورت میں رہی اور کسی شخص کو اس کی اطلاع نہ ہوئی اور نہ کوئی انتشار پیدا ہوا نہ اضطراب۔

مورخ کا بیان'' آپ نے یہ صورت اس لئے اختیار کی کہ آپ کو خیال تھا کہ عام عرب راستہ سے آپ کے ساتھ عبداللہ بن یقطر جو حضرت کے رضاعی بھائی تھے اور آپ نے ان کو راستہ سے روانہ فرمایا تھا ان کی شہادت کی بھی خبر آ گئی اور حضرتؑ نے سن لی۔ عام قافلہ والے اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کوفہ کی فضا امامؑ کے موافق ہے۔ لیکن امامؑ لوگوں کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانا کب منظور کر سکتے ہیں۔ آپ نے چاہا کہ حقیقتِ حال واضح ہو جائے۔ چنانچہ جب آپ منزل پر پہنچے تو آپ نے قیام فرمایا۔ اور ایک تحریر جسے سرکاری بیان کہنا چاہیے، آپ نے تمام اہل قافلہ کے مجمع میں سب کو پڑھ کر سنائی۔

''**بسم اللہ الرحمن الرحیم امّا بعد، فقد اتانا خیر فظیع قتل مسلم بن عقیل و ھانی بن عروۃ و عبداللہ بن یقطر و قد خذلتنا شیعتنا فمن احبّ منکم الا نصراف فلینصرف فلیس علیہ منا ذمام**''۔

''ہمارے پاس ایک دردناک خبر پہنچی ہے کہ مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن یقطر شہید کر ڈالے گئے اور وہ لوگ جو ہماری دوستی کا دعویٰ کرتے تھے انھوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورتِ حال کے بعد جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہے۔''

یہ حضرت کی تقریر تھی جس کے بعد ''**تفرق الناس عنہ تفرّقا فاخذو ایمینا و شمالا حتی بقی فی اصحابہ الذین جآء و امعہ من المدینۃ**'' ''لوگ متفرق ہونے لگے اور کوئی داہنی طرف کوئی بائیں طرف اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ یہاں تک کہ بس وہی منتخب جماعت رہ گئی جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئی تھی۔'' اس طرح سے مجمع چھٹ گیا اور صرف وہی لوگ رہ گئے جو آپ کی مکہ معظّمہ والی تقریر سن چکے تھے اور حقیقتاً موت پر آمادہ تھے۔

ہوگئے ہیں اس گمان پر کہ آپ ایسے شہر جارہے ہیں جہاں کے لوگ پورے طور سے آپ کے فرماں بردار اور مطیع ہیں، جہاں کی زمین پورے طور سے ہموار ہو چکی ہے۔ آپ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔ آپ نے چاہا کہ صرف وہی لوگ آپ کے ساتھ رہ جائیں جو حقیقتِ حال سے مطلع ہوں اور سمجھ چکے ہوں کہ صورت حال کیا ہے۔ آپ کو یقین تھا کہ آپ کے اعلان کے بعد بس وہی لوگ رہ جائیں گے جو آپ کے سچے ہمدرد اور آپ کے ساتھ جان دینے پر تیار ہیں۔''[1]

راستہ کی منزلیں ختم ہوئیں اور اب وہ وقت ہے کہ حضرتؑ کربلا پہنچ چکے۔ صلح کی گفتگو ختم ہو چکی اور دشمن نے حملہ بھی کر دیا۔ صرف ایک رات کی مہلت ملی ہے اور وہ بھی بمشکل عبادتِ خدا کے لئے۔ مگر امام حسینؑ اب بھی اتمامِ حجت کرتے ہیں۔ ساتھیوں کو ایک آخری موقع دیتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ اب جو لوگ تھے وہ منتخب، وہ حقیقتاً موت پر تیار مگر حضرتؑ نے چاہا کہ ان کا بھی امتحان ہو جائے اور ان کے ثباتِ قدم کا بہترین مظاہرہ سامنے آجائے۔

چنانچہ امام زین العابدینؑ کی روایت ہے کہ جب عمر بن سعد سے ایک شب کی مہلت مل گئی اور عمر سعد کی فوج واپس گئی تو حضرتؑ نے اپنے اصحاب کو جمع فرمایا۔

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ میں بیمار تھا مگر ذرا قریب پہنچا کہ سنوں حضرتؑ کیا فرماتے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ ''**اثنی علی اللّٰہ تبارک وتعالیٰ احسن الثنآء واحمدہ علی السرآء والضرّآء**'' میں خدا کی بہترین ثنا کا فرض ادا کرتا اور سختی ہو یا آسانی ہر حال میں اس کا شکر کرتا ہوں۔

''**اللّٰھم انی احمدک علی ان اکرمتنا بالنبوّۃ وعلمتنا القراٰن وفقھتنا فی الدین وجعلت لنا اسماعا وابصارا وافئدہ ولم تجعلنا من المشرکین**''۔

''خداوندا میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے نبوت عطا کر کے ہماری عزت بڑھائی اور قرآن کی تعلیم ہم کو عطا کی اور دین میں ہم کو فقیہ قرار دیا۔ ہم کو تو نے گوشِ شنوا اور چشم بینا اور قلبِ دانا عطا فرمائے اور ہم کو تو نے جماعتِ مشرکین سے نہیں قرار دیا۔''

''**اما بعد فانّی لا اعلم اصحابا اوفی ولا خیرا من اصحابی ولا اھل بیت ابرّ ولا اوصل من اھل بیتی فجزاکم اللّٰہ عنّی جمیعاً خیرا**'' (اب حضرتؑ اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور فرماتے ہیں۔) ''مجھے علم نہیں ہے کہ دنیا میں کسی کے اصحاب میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اور ان سے بہتر ہوں (اصحاب کا ذکر پہلے کر دیا اس لئے کہ غیروں کا معاملہ تھا، مگر خیال ہوا کہ عزیزوں کی دل شکنی نہ ہو اس لئے اصحاب کے بعد عزیزوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوا) اور نہ مجھے کسی کے اعزّا (خاندان والے) معلوم ہیں جو میرے عزیزوں سے زیادہ حق شناس اور مطیع وفرمانبردار ہوں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے نیک بدلہ دے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔''

''**الا وانی اظن یؤمنا من ھٰولآءِ الا عدآء غدا الاوانی قد رأیت لکم فانطلقوا جمیعاً فی حل لیس علیکم منی ذمام ھٰذالیل قد غشیکم فاتخذوہ جملا**''۔

آگاہ ہو کہ میرے خیال میں کل کا دن ہمارا ان اعداء کے ساتھ تاریخی دن ہوگا۔ میں نے تمہارے متعلق غور کیا ہے اور میری رائے تمہارے لئے یہ ہے کہ تم سب اس وقت چلے جاؤ اور میری اجازت ہے کہ میرا ساتھ چھوڑ دو، کوئی تمہارے اوپر میری طرف سے ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ دیکھو یہ رات کا پردہ پڑ گیا ہے، اسے تم اپنے لئے غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ

---

[1] (طبری، ج۶، ص۲۲۶)

اٹھاؤ۔‘‘

عزیزوں سے خود نہیں کہا کہ تم چلے جاؤ۔ مگر اس لئے کہ اصحاب کو برا نہ معلوم ہو۔ اصحاب سے یہ فرمایا کہ ’’لیا خذ کل رجل منکم بید رجل من اھل بیتی ثم تفرّقوافی سوادکم ومدائنسکم حتیٰ یفرج اللہ فان القوم انما یطلبونی ولو قداصابونی لھماعن طلب غیری‘‘۔

’’تم خود جاؤ اور اتنا اور بھی کرو کہ ہر ایک تم میں سے ایک ایک میرے عزیز کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے ساتھ لیتا جائے۔ اس کے بعد اپنے اپنے دیہات اور شہروں میں متفرق ہوجاء۔ تاوقتیکہ تمہیں کشائش اور بنی امیہ کی سلطنت سے نجات حاصل ہو اور اس لئے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں اگر میں انہیں مل جاؤں اور مجھ کو قتل کر ڈالیں تو پھر انہیں کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی۔‘‘

بس یہ اتمامِ حجت تھی۔ لیکن ایسی جماعت کے سامنے جس کا کوئی فرد حقیقت حال سے بے خبر ہو کر ساتھ نہیں آیا تھا کوئی لالچ اور طمع دنیوی پیش نظر رکھ کر شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ایک طرف اعزّا کھڑے ہوگئے، بھائی، بیٹے، بھتیجے اور عبداللہ بن جعفرؑ کی اولاد اور سب نے کہا جن میں سب سے پہلے بولنے والے حضرت عباسؑ بن علیؑ تھے کہ ’’لم نفعل لنبقی بعدک لا ار انا اللہ ذلک ابدا‘‘ ’’یہ کیوں؟ کس لئے؟ کس واسطے ہم واپس چلے جائیں؟ اس لئے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا ہم کو یہ روزِ بدنصیب نہ کرے۔‘‘

حضرت متوجہ ہوئے اولادِ عقیلؑ کی طرف اور فرمایا۔

’’تمہارے لیے مسلمؑ کا قتل ہونا کیا کم ہے؟ تم تو چلے جاؤ، تم کو میں نے اجازت دے دی۔‘‘

انھوں نے کہا۔ ’’ایسا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہم بھی اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار کریں گے۔‘‘

اصحاب بظاہر اعزّا کے احترام کی وجہ سے خاموش تھے۔

جب اعزّا اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تو وہی اسی برس کا ضعیف العمر جان نثار مسلم بن عوسجہ مجمع کے درمیان سے کھڑا ہوا۔ انصارِ حسینؑ میں ان سے زیادہ مسن کوئی نہ تھا۔ پشت خمیدہ اور جسم کمزور تھا مگر دیکھنے کی بات ہے کہ کہیں الفاظ سے دل کی کمزوری نمایاں نہیں ہے۔ عرض کرتے ہیں:

’’انحن نخلی عنک ولمّا نعذ رالی اللہ فی اداء حقک اما واللہ اطعنھم حتیٰ اکسر فی صدورھم رمحی واضربھم بسیفی ما ثبت قائمة فی یدی ولا افارقک ولو لم یکن معی سلاح اقاتلھم بہ لتذفتھم بالحجارةدونک حتیٰ اموت معک۔‘‘

’’ہم آپ کو چھوڑ دیں؟ اس صورت میں خدا کو کیا جواب دیں گے؟ خدا کی قسم میں ان دشمنوں کو اتنے نیزے لگاؤں گا کہ ان کے سینوں میں میرا نیزہ ٹوٹ جائے اور اس وقت تک شمشیر زنی کروں گا جب تک اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں رہے، میں آپ سے کسی وقت جدا نہ ہوں گا۔ اور اگر ہتھیار میرے پاس نہ ہوں گے اور بیکار ہوجائیں گے۔ تب بھی پتھروں سے ان سے جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی نصرت میں کام آؤں اور آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کروں۔‘‘

مسلم بن عوسجہ نے جو کہنا تھا وہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ تب ان سے کم عمر کے جو لوگ تھے ان کو جرأت ہوئی کچھ کہنے کی۔ یہ ادب تھا، یہ اخلاقی تربیت تھی۔ یہ شائستگی تھی۔ جس طرح بنی ہاشم سے پہلے اصحاب نے کچھ نہیں کیا۔ اسی طرح اصحاب میں کسی نوعمر آدمی کو اس وقت تک جرأت نہیں ہوئی۔ جب تک مسلم اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر چکے۔

اب سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے، انھوں نے کہا:

’’واللہ لا نخلّیک حتیٰ یعلم اللہ انّا قد حفظنا غیبتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیک واللہ لو علمت

انی اقتل ثم احیا ثم احرق حیّاثم اذ ریفعل ذلک بی سبعین مرۃ مافارقتک حتیٰ القیٰ حمامی دونک فکیف لا افعل ذلک وانّما ھی قتلۃ واحدۃ ثم ھی الکوامۃالتی لاانقضاءلھاابدا''۔

''خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے جب تک ثابت نہ کردیں کہ ہم نے جنابِ رسولِ خداؐ کی وصیت کو جو آپ کے بارے میں تھی پورا کردیا۔ خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا، پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر جیتے جی آگ میں جلایا جاؤں گا، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی، ایسا ہی میرے ساتھ ستّر مرتبہ سلوک ہوگا تب بھی آپ سے جدا نہ ہوں گا جب تک کہ آخری موت آپ ہی کے قدموں پر نہ آئے۔ چہ جائیکہ اب میں آپ کا ساتھ چھوڑوں گا؟ حالانکہ جانتا ہوں کہ ایک ہی مرتبہ قتل ہونا ہے اور اس کے بعد زندگی ہی زندگی اور عزتِ دائمی ہے۔''

اس کے بعد زہیر بن القین کھڑے ہوئے۔ یہ وہی پُرجوش جان نثار ہیں جنھوں نے حر کے معاملہ میں کہا تھا کہ ہمیں ان سے لڑ لینے دیجئے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کہا (معلوم ہوتا ہے دلوں میں وہ تلاطم ہے کہ الفاظ تلاش کرتے ہیں مگر مطلب ادا کرنے کو ملتے نہیں۔)

''خدا کی قسم میری تو یہ آرزو ہے کہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں، یونہی ہزار مرتبہ میرے ساتھ سلوک ہو، لیکن کسی طرح آپ کی اور آپ کے اعزّا و اقارب ان ہاشمی جوانوں کی جان بچ جائے جو آپ کے ساتھ ہیں۔''

دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب نے متفق اللہجہ یہ کہا کہ:

''ہم آپ سے جدا نہیں ہوں گے۔ بلکہ اپنی جان آپ پر فدا کریں گے۔''

اپنے سینے، سر، بازو، تمام اعضاء و جوارح آپ کی نصرت میں صرف کردیں گے۔ جب ہم مرجائیں گے اور دنیا سے رخصت ہوجائیں گے تو اس وقت سمجھیں گے کہ ہم نے وفا کی اور جو ہمارا فرض تھا اس کو ادا کردیا(۱)''

امام حسینؑ نے اس طرزِ عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا میں حقانیت، ضمیر کی صفائی اور امانت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کسی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد نہ نکالے۔ کبھی غلط توقعات قائم کرکے اپنی کاربرآری نہ کرے۔ غلط فہمی کا سدِّ باب کرکے جو حقیقی جان نثار ہیں بس ان کی ہمدردی کو قبول کرے اور کسی کی غلط اندیشی و فریب پذیری سے فائدہ نہ اٹھائے۔

چند مختلف سبق

واقعۂ کربلا اور اس کے عملی نتائج ایک طویل الذیل موضوع ہے۔ واقعۂ کربلا کا ہر جزئی واقعہ سرچشمہ ہے اخلاقی تعلیمات کا، اجتماعی تعلیمات کا، مذہبی تعلیمات کا۔

امام حسینؑ نے تمام کمالاتِ انسانی کا مرقع پیش کردیا تھا۔ اور حقیقت میں واقعۂ کربلا ایک وہ واقعہ ہے جس میں حق و باطل کے تمام خصوصیات بے نقاب ہوکر سامنے آگئے تھے۔

یعنی اس عظیم فیصلہ کن تاریخی واقعہ کے پہلے حق و باطل کی صورتیں مشتبہ تھیں۔ خصوصیات نمایاں نہ تھے لیکن واقعۂ کربلا کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف حق کے اندر جتنے دلفریب خوش آئند، مستحسن خط و خال ہیں وہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے آگئے اور دوسری طرف باطل میں جتنی برائیاں، خرابیاں، بہمیت، وحشیت کی صفتیں ہیں وہ سب عالم کے پیش نظر ہوگئیں۔

حسینؑ نے کربلا میں جتنے گرانقدر سبق دیئے ہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں کہ انھیں نگاہِ غلط انداز سے دیکھ کر نذرِ تغافل کردیا جائے بلکہ وہ ایسے ہیں کہ انھیں لائحہ زندگی اور دستور العملِ حیاتِ ملّی قرار دیا جائے۔

انھوں نے صلح اور رواداری کی تعلیم دی۔ امن پسندی کا

---

(۱) طبری، ج۶، ص۲۳۸۔۲۳۹۔

سبق دیا۔ حمایتِ حق کا اصول بتایا۔ استقلال اور ثباتِ قدم کا نمونہ دکھلایا۔ یہ تمام وہ باتیں جن کا تذکرہ سابق میں ہو چکا ہے اس سب کے علاوہ آپ نے یہ بھی تعلیم دی کہ کس طرح ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ احسان کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔ اس کے وقت پر کام آنا چاہیئے۔ اگر چہ وہ اپنا دوست نہ ہو دشمن ہو، دوستوں کے ساتھ مراعات واحسان کرنا ایک معتدل الفطرت انسان کا خاصۂ مزاج ہے اور کوئی غیر معمولی امر نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ احسان کرنا، ان لوگوں کے ساتھ سلوک نیک کرنا جو اپنے سے جنگ پر تیار ہوں، ان کی ضرورت پر کام آنا جو اپنے خون کے پیاسے ہوں، یہ ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سبق حسینؑ نے دیا۔ اس وقت جب منزلِ شراف سے آگے بڑھے ہیں حکم دیا کہ پانی مشکوں میں بھر لو اور جتنا ممکن ہو زیادہ پانی اپنے ساتھ لے لو۔ اصحاب نے تعمیل حکم کی اور پانی کثرت سے اپنے ساتھ لے لیا۔ یہاں تک کہ حضرتؑ اس منزل سے آگے بڑھے۔ راستہ برابر قطع ہو رہا تھا کہ سامنے سے فوج آتی ہوئی نظر آئی۔ حضرت نے راستہ اپنا بدل کر ذوجسم پہاڑی کے پاس جا کر قیام کیا۔

آتی ہوئی فوج بھی اسی طرف متوجہ ہوئی اور تھوڑی دیر میں امامؑ کی فوج کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ یہ حر کا ایک ہزار آدمیوں کا رسالہ تھا اور حضرتؑ کے سدِ راہ ہونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لیکن حالت اس وقت یہ تھی کہ پیاس کا غلبہ ہو گیا تھا۔ چہرے اداس تھے اور راکب و مرکب شدتِ عطش سے جان بلب تھے۔ بس اب حسینؑ کے لئے دوست و دشمن کا سوال کوئی چیز نہ تھا۔ حسینؑ کے دل پر اس حالت کو دیکھ کر چوٹ پڑ رہی تھی اور اس سے مطلب نہ تھا کہ فریقِ مقابل آپ سے جنگ کے لئے آیا ہے۔ آپ کو یہ بھی پروانہیں ہوئی کہ ہم کو خود اس کے بعد کس طرح کے جنگلوں میں چلنا ہوگا اور پانی دستیاب ہوگا یا نہیں۔

حضرتؑ نے حکم دیا کہ ''**اسقوا القوم وارادوھم من الماء ورشفوا الخیل توشیفا**''۔

''ان لوگوں کو پانی پلاؤ اور سیراب کر دو اور ان کے گھوڑوں کو بھی پانی پلا کر سیراب کر دو''۔

حسینی فوج کے نوجوان کھڑے ہوگئے اور پانی پلانے میں مصروف ہو گئے تمام فوج کو معہ راکب و مرکب کے سیراب کر دیا۔ حالت یہ تھی کہ طشتوں میں، کاسوں میں، پیالوں میں پانی بھر بھر کر گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے اور جب ایک ایک گھوڑا پانی سے سیراب ہو کر تین، چار، پانچ، مرتبہ منہ الگ کر لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے یہاں تک کہ جتنے گھوڑے تھے سب کو سیراب کر دیا۔

علی بن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں حر کی فوج میں سب سے آخر میں رہ گیا تھا۔ مجھ پر پیاس کا انتہائی غلبہ تھا۔ حضرتؑ نے جو میری اور میرے گھوڑے کی پیاس دیکھی تو فرمایا ''**انخ الراویہ**'' راویہ کو بٹھا لے۔ (راویہ شتر آب کش کو کہتے ہیں) یہ شخص عراق کا رہنے والا تھا، وہ راویہ کے معنی مشک کے سمجھتا تھا، اس لئے کچھ معنی اس کی سمجھ میں نہ آئے حضرتؑ نے فرمایا: ''**یا ابن اخی انخ الجمل**'' یہ مہربانی ہے، یہ ملائمت ہے، مخاطب بظاہر نوعمر آدمی تھا۔ اسے بیٹا، بھتیجا فرما کر خطاب کر رہے ہیں۔ میرے بھائی کے فرزند جمل (اونٹ) کو بٹھا دو'' اس نے اونٹ کو بٹھا دیا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ ''پیو، پانی پیو'' راوی کا بیان ہے کہ میں اتنا بدحواس تھا پیاس کی وجہ سے کہ جب پانی پینا چاہتا تھا پانی بہنے لگتا تھا۔ کسی طرح میرے منہ میں نہ جاتا تھا، حضرتؑ نے فرمایا ''مشک کو اپنی طرف موڑ لے'' میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ کس طرح سے پانی پیوں۔ تب حضرتؑ خود اپنی جگہ سے اٹھے اور قریب تشریف لا کر اپنے ہاتھ سے مشک کے دہانہ کو درست فرمایا اور جب میں اور میرا گھوڑا سیراب ہو لئے تب حضرتؑ تشریف

لے گئے۔

یہ تھی اخلاقی تعلیم۔ یہ تھی حسینی تعلیم۔ اس طرح بتایا کہ کس طرح دشمنوں کے ساتھ انسانوں کو حسنِ سلوک کرنا چاہیئے۔ کس طرح دشمن کی بھی امداد کرنا چاہیئے۔ جہاں تک اس کی امداد سے حمایتِ باطل نہ ہو۔

شخصی وانفرادی حیثیت سے کافر بھی ہوتو اس کی مدد کرنا چاہیئے مگر اس کے کفر میں امداد نہ کرے اور حمایتِ باطل کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ تو دشمنوں کے ساتھ حضرتؑ کے حسنِ سلوک کا نمونہ تھا۔ دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اپنوں میں کس طرح انسان کو مساوات مدِ نظر رکھنا چاہیئے اس کا بھی بہترین سبق امام حسینؑ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ قبل کے واقعات کا تذکرہ اہم نہیں ہے اس لئے کہ سفر سہی، مگر اطمینان کا وقت تھا، امن وسکون کا دور تھا، کوئی ایسی سخت صورتِ حال نہ تھی۔ مگر عاشور کے دن جب مصائب کا ہجوم تھا اس وقت حسینؑ نے کس طرح سے حقوق کا لحاظ کیا ہے۔ کس طرح یہ خیال رکھا ہے کہ جانبداری اور کسی خاص پاسداری کا پہلو پیدا نہ ہونے پائے، عزیز بھی تھے اور غیر بھی تھے، مگر آپ کا طرزِ عمل سب کے ساتھ مساوی تھا، کسی طرح کی خصوصیت جو عزیزوں کے ساتھ ہو وہ غیروں کے ساتھ نہ برتی گئی ہو، ناممکن ہے۔ جو شہید گھوڑے سے گرا حضرتؑ خود تشریف لے گئے، کوئی تخصیص نہیں۔ آزاد بھی تھے اور غلام بھی تھے، قریش بھی تھے اور غیر قریش بھی۔ ہاشمی بھی تھے اور غیر ہاشمی بھی، اپنے دل کے ٹکڑے بھی تھے اور اغیار بھی۔ مگر سب کے ساتھ یکساں برتاؤ۔ متحد طرزِ عمل، کہیں تفریق نہیں چاہے اس میں خود حضرتؑ کے نفس کو کتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی ہو۔

جنگ کے میدان میں اور خیام کی جگہ میں کافی فاصلہ تھا۔ جو شہید جنگ کے لئے جاتا تھا وہ میدان میں لڑتا اور وہیں شہید ہو کر گرتا تھا۔ اب ملاحظہ فرمایئے امامؑ کا تعب، امامؑ کی تکلیف، حضرتؑ کی ہر شہید کی لاش پر جانا، اور پھر اس کی لاش لے کر واپس آنا۔ اس طرح اکہتر دفعہ اس طویل مسافت کو طے کرنا، جانا اور پھر واپس آنا، اس دھوپ میں اس گرمی میں، اس تمازتِ آفتاب میں اتنی تکلیف، اتنی زحمت، اتنی مشقت برداشت کی مگر یہ نہیں ہوا کہ کسی شہیدِ راہِ خدا کے حق میں کوتاہی ہو جاتی۔

نہیں، سب کے ساتھ عزیزوں کا سا برتاؤ۔ جو آتا تھا اجازت مانگتا تھا۔ بغور اسے دیکھتے تھے اجازت دیتے تھے، جب تک وہ جنگ کرتا تھا کھڑے ہو کر اس کی جنگ کا مشاہدہ فرماتے تھے جب گرتا تھا فوراً لاش پر پہنچتے تھے۔

اس طرح یہ بتایا کہ کس طرح ایک سردار، ایک رئیس، ایک افسر کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مساوات اور یگانگی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ایک سرگروہ کا فرض کیا ہے۔ اسے اپنے ساتھ جان صرف کرنے والوں کے ساتھ کیا برتاؤ اختیار کرنا چاہیئے۔

مجھے معلوم ہے اصحاب اتنے باوفا تھے کہ اگر یہ طرزِ عمل نہ بھی ہوتا تب بھی ان کے ارادوں میں تزلزل نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اس برتاؤ کے غلام بن کر جان نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ ایک اصول کے تحت میں اپنی جان قربان کر رہے تھے۔ لیکن یہ آپ کی فرض شناسی تھی۔ یہ آپ کی اخلاقی تعلیم تھی۔

اس وقت تک حقوق الناس کا تذکرہ تھا۔ اب حقوق اللہ کی مراعات ملاحظہ ہو۔ خدا کے ساتھ ایک بندہ کا جو واسطہ ہوتا ہے اس کا کس حد تک امامؑ نے خیال کیا اور کس طرح امامؑ کے ساتھیوں نے اس کا خیال رکھا۔

ایک شب کی مہلت مانگی اور وہ بمشکل ملی۔ ایک دنیا سے جانے کے لئے تیار انسان، اس کے دل میں کیا کیا تمنائیں ہوتی ہیں۔ امامؑ نے ایک شب کی مہلت لی۔ کیا اعزا سے ملنے کے لئے، کیا اس لئے کہ ایک شب اہلِ حرم کو جی بھر کر دیکھ

لیں، اپنے بعد کے متعلق ہدایتیں کردیں؟ نہیں یہ کچھ نہیں بلکہ صرف خدا کی عبادت کے لئے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا۔ ضحاک بن عبداللہ مشرقی ناقل ہیں۔

فلما امسیٰ حسین و اصحابه قاموا للیل کله یصلون ویستغفرون ویدعون ویتضرعون۔

''جب شام ہوئی تو امامؑ اور آپ کے اصحاب نے تمام رات گزاری کھڑے کھڑے نماز کی حالت میں دعا اور استغفار اور تضرع کی حالت میں''(۱)

ابھی پھر بھی آسان تھا۔ مگر وہ وقت کہ جب عاشور کے قیامت خیز دن کے ظہر کا وقت آچکا ہے، موت کا بازار گرم ہے۔ اصحاب میں بہت آدمی شہید ہو چکے ہیں۔ مسلم بن عوسجہ، عبداللہ بن عمر، بریر بن خضیر، عمرو بن قرظہ، نافع بن ہلال وغیرہ امامؑ کا ساتھ چھوڑ کے راہیٔ جنت ہو گئے ہیں۔ نماز ظہر کا وقت آیا۔ ابوثمامہ، عمرو بن عبداللہ صائدی حاضرِ خدمتِ امامؑ ہوئے اور عرض کی۔

''**یا ابا عبدالله نفسی لک الفداء انی اریٰ هٰؤُلآءِ قد اقتربوا منک ولا والله لا تقتل حتیٰ اقتل دونک ان شاء الله واجب ان القیٰ ربّی وقد صلیت هٰذه الصّلوٰة الّتی قد دنا وقتها**''۔

''یا ابا عبداللہؑ! میری جان آپ پر نثار، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ آپ کے بہت قریب آ گئے ہیں لیکن خدا کی قسم آپ پر کوئی آنچ نہیں آسکتی جب تک میں آپ کے سامنے قتل نہ ہو جاؤں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خدا کے یہاں جو جاؤں تو یہ نماز آپ کی معیت میں پڑھ کر جس کا وقت قریب آ گیا ہے۔''

امام حسینؑ نے اپنا سر اٹھایا۔ فرمایا:

''**ذکرت الصلوٰة جعلک الله من المصلین الذاکرین نعم هذا اوّل وقتها**''۔

---

(۱) طبری، ج۶، ص ۲۴۰۔

''تم نے اس وقت میں بھی نماز کو یاد رکھا خدا تم کو نماز گذاروں اور نماز کے یاد رکھنے والوں میں محسوب فرمائے۔ ہاں یہ تو اولِ وقت ہے نماز کا''۔

پھر فرمایا ''ان سے کہو اتنی مہلت دے دیں کہ ہم نماز پڑھ لیں۔''

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مہلت نہیں ملی اور دشمن کی فوج نے جنگ سے ہاتھ نہیں روکا۔ حصین بن تمیم نے مہلتِ نماز کی خواہش پر یہ جواب دیا ''**انها لا تقبل**''، جس پر حبیب بن مظاہر کو غصہ آ گیا۔ ''نماز قبول نہ ہوگی؟ ارے تیری نماز قبول ہو اور اولادِ رسولؐ کی نماز قبول نہ ہو؟'' حصین بن تمیم نے حملہ کر دیا اور حبیب بن مظاہر نے اس سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کو زخمی کر دیا۔ اور لوگ اس کو حبیب کے ہاتھ سے چھڑا کر لشکر میں لے گئے۔ حبیب نے جوش میں رجز پڑھا۔

اقسم لَو کنا لکم اعدادا

او شطر کم ولّیتم اکتادا

یا شرّ قوم حسبا واُدا

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہماری تعداد تمہاری اتنی ہوتی یا تمہاری تعداد کی نصف بھی ہوتی تو تم میں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہ رہتا اور میدانِ جنگ صاف نظر آتا۔''

اس رجز کے بعد شاید یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ہماری قلت تعداد کمزوری کی دلیل نہ سمجھا جائے اس لئے دوسرا رجز پڑھنے لگے۔

انا حبیب وابی مظاهر		**فارس هیجآء وحرباء**
انتم اعدّ عدة واکثر		**ونحن او فی منکم واء**
ونحن اعلیٰ حجّة واظهر		**حقّا واتقیٰ منکم وا**

''میں حبیب ہوں اور میرے باپ کا نام مظاہر ہے۔ شہسوار ہوں میدانِ جنگ کا، ایسی جنگ کا جس کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ تم بے شک تعداد میں زیادہ ہو اور بہت ہو مگر یاد

رکھنا کہ ہم وفا میں تم سے زیادہ اور صبر و استقامت میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز تمہاری (تعداد زیادہ ہوتو ہو) ہم حق پر ہیں ہماری حجت تم سے زیادہ قوی اور روشن اور ہمارا تقویٰ مستند اور ہماری حجت تمام ہے۔''

اس سے حبیب نے اکثریت کے عام معیارِ حقیت کو باطل کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کثرت دلیلِ حقانیت نہیں ہے نصرت ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہماری شکست بھی فتح اور ہماراانجام دائمی زندگی ہے آپ نے بہت سخت جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

میری جہاں تک سمجھ میں آتا ہے دشمن نے جنگ کو ملتوی نہیں کیا۔ مگر کیا کہنا اصحابِ حسینؑ کی فرض شناسی اور عبادتِ الٰہی کے ذوق وشوق کا۔ وہ بھی ایک اتمامِ حجت تھی جو جنگ روکنے کی خواہش کی تھی۔ مگر جب جنگ نہیں رکی تو ثابت کر دیا کہ ہم جنگ رکنے کے محتاج نہیں ہیں۔ امیر المومنینؑ نے بھی اس کا عملی سبق دیا تھا۔ جنگِ صفین میں آپ کا مصلیٰ دونوں صفوں کے درمیان بچھا دیا گیا تھا۔

ابن عباس نے کہا تھا کہ یہ وقت نماز کا ہے؟ تو حضرتؑ نے فرمایا تھا کہ ''اسی نماز کے لئے تو ہم جنگ کر رہے ہیں۔''

''آئمہ معصومینؑ نے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اگر حقیقی محبت کوئی ہمارے ساتھ رکھتا ہے تو اس کو ان فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے۔''

امام حسینؑ نے ایسے سخت ترین موقع پر جب دنیا کا کوئی شخص مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔ جب کہ کسی شخص کو فرائض کا احساس باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ ان فرائض کو ادا کر کے یہ سبق دے دیا کہ چاہے کیسا ہی سخت موقع پڑے لیکن فرض شناسی سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ صلوٰۃ خوف کی صورت سے نماز ادا کی۔ دو جان نثاروں کو سامنے کھڑا کیا۔ ایک سعید بن عبداللہ حنفی اور دوسرے زہیر بن القین۔ جو تیر آتا تھا یہ دونوں بزرگوار اپنے اوپر روکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے میدانِ جنگ قبلہ رخ تھا۔ اگر قبلہ سے علیحدہ ہوتا تو امام مصلے پر ہوتے اور جماعت پیچھے۔ امامؑ کے سامنے کھڑے ہونے والے دو آدمی آپ کا بچاؤ کر لیتے۔ لیکن پوری جماعت دشمنوں کے تیروں کے مقابل ہوتی۔ امامؑ کو یہ گوارا نہیں ہوسکتا تھا کہ دوسرے لوگ تیروں کا نشانہ ہوں اور آپ بچ جائیں۔ لیکن جب میدانِ جنگ قبلہ کے رخ پر ہوتو آگے سب کے امامؑ اور پیچھے مجاہدین کی صفِ نماز۔ دو آدمی بھی جو امامؑ کے سامنے کھڑے ہو گئے تو صرف امامؑ کا نہیں تمام جماعت کا بچاؤ ہو گیا اور اس طرح نماز ادا کی گئی۔ ادھر نماز ختم ہوئی ایک آدمی ان دو جان نثاروں میں سے یعنی سعید بن عبداللہ تیروں سے مجروح ہو کر زمین پر گر پڑا اور دنیا سے رخصت ہوا کیا کہنا اس نماز کا اور کیا کہنا ان مجاہدین کے ادائے فرض و ادائے حق وفا کا۔ اب اصحاب نے شوقِ شہادت میں جانیں دینا شروع کیں امام حسینؑ اسی طرح اپنے فرائض اور سب کے حقوق ادا کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی باقی نہیں رہا۔ سب شہید ہو گئے۔ اعزّا کی باری آئی۔

تاریخ نے سب واقعات کو بیان ہی کہاں کیا ہے۔ اس لئے کہ دوست باقی بچے نہیں تھے۔ دشمنوں کو غرض کیا تھی کہ تمام واقعات بیان کرتے۔ یقیناً اگر موقع ہوتا تو حضرت اعزّا کو اصحاب سے پہلے میدانِ جنگ جانے کی اجازت دیتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب نے کسی طرح اس کو منظور نہیں کیا کہ ان کی زندگی میں کوئی شخص اولادِ ہاشم سے میدانِ جنگ میں جائے۔ مگر جب اصحاب شہید ہو چکے اور دل کے ٹکڑوں کی نوبت آئی تو اب بھائی کی اولاد تھی۔ یعنی امام حسنؑ کے صاحبزادے، چچازاد بھائی کی اولاد یعنی مسلمؑ کے فرزند، چچا کے بیٹے یعنی عقیلؑ کی اولاد۔ پھر ایک چچازاد بھائی کے بیٹے یعنی عبداللہ بن جعفرؑ کے صاحبزادے جو بھانجے کہے جاتے ہیں

اپنے باپ کی اولاد یعنی بھائی اور خود اپنی اولاد۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ کوئی اور میدان جنگ میں نہ جانے پائے اور یہ کہنے کو نہ ہو کہ بھائی کی اولاد تھی نا اس لئے اسے پہلے بھیج دیا یا چچا کی اولاد کو پہلے بھیج دیا۔ اس لئے تاریخ کی مسلمہ حقیقت یہ ہے۔ حدیث اور تاریخ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اعزّا میں سب سے پہلے جناب علی اکبرؑ کو میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت ملی ہے۔ حدیث کلام معصومؑ کا نام ہے۔ کلامِ معصومؑ یعنی زیارت میں جو جناب علی اکبرؑ کے لئے وارد ہے صاف طور سے پہلا فقرہ یہ ہے کہ: ''**السلام علیک یا اوّل قتیل من نسل خیر سلیل من سلالۃ ابراھیم الخلیل**''۔

''سلام ہو آپ پر اے سب سے پہلے شہید ہونے والے نسل سے بہترین شخص کی اولاد ابراہیم خلیلِ خدا میں سے''۔

تاریخ کی حیثیت سے طبری کی تاریخ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ ''**کان اوّل قتیل من بنی ابی طالب یومئذ علی الاکبر بن الحسین بن علی و امہ لیلیٰ ابنۃ ابی مرّۃ بن عروۃ بن مسعود الثقفی**''۔

''سب سے پہلے مقتول اس دن ابو طالبؑ کی اولاد میں علی اکبرؑ ہیں جو حسینؑ کے فرزند تھے اور آپ کی والدہ ام لیلیٰؑ تھیں۔ جو ابو مرہ ابن عروہ بن مسعود ثقفی کی بیٹی تھیں۔''

آپ نے جب حملہ کیا تو یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا علیّ بن حسین بن علی

نحن و رب البیت اولیٰ بالنّبی

تاللہ لا یحکم فینا ابن الدعی

دیکھئے یہ رجز بھی تبلیغی رجز ہے۔ اس میں حمایتِ حق کے جذبہ کا اظہار ہے۔ ''میں ہوں علی، حسین بن علیؑ کا فرزند، ہم خانہ کعبہ کے پروردگار کی قسم نبیؐ کے سب سے زیادہ حقدار ہیں'' خدا کی قسم زنا زادہ کی اولاد ہماری حاکم نہیں ہوسکتی۔(۱)

امام حسینؑ کو یہ دکھلانا تھا کہ حمایتِ حق کے موقع پر سب سے زیادہ اپنے عزیز ترین شخص ہی کو فدا کرنا چاہیئے۔ سب سے زیادہ جو اپنے سے قریبی تعلق رکھتا تھا اس کو سب سے آگے بھیج دیا۔ وہی رسالت مآبؐ کا طرزِ عمل جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ جب جنگ کا موقع ہوتا تھا۔ آپ اپنے خاص عزیزوں کو آگے رکھتے تھے۔ چنانچہ عبیدہ جنگِ بدر میں شہید ہوئے اور حمزہؑ جنگِ احد میں۔ اسی طرح امیر المومنینؑ نے جنگِ جمل میں علمِ لشکر اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو دیا اور فوجِ دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور اسی کا مکمل نمونہ امام حسینؑ نے کربلا میں پیش کیا کہ سب سے پہلے اپنے فرزند کو اجازت دے دی۔ جب وہ شہید ہو گئے تو پھر اور اعزّا میدانِ جنگ میں گئے۔ طبری میں جناب علی اکبرؑ کے بعد سب سے زیادہ محبوب حضرت کو قاسمؑ ہی ہوں گے اسی لیے علی اکبرؑ کے بعد قاسمؑ کو میدانِ جنگ میں روانہ فرمایا۔

جناب عباسؑ، وہ امام حسینؑ کی اطاعت کے بڑے پابند تھے جو حسینؑ کی سیرت تھی وہ ہی جناب عباسؑ کی، میں نے جس طرح امامؑ کے متعلق عرض کیا تھا کہ امامؑ نے سب کو اپنے سامنے میدانِ جنگ میں بھیج دیا۔ تاکہ سب کی مصیبت آپ برداشت کریں۔ اس کے بعد اپنی جان دے دینا تو آسان ہے۔ وہی جناب عباسؑ نے بھی کیا۔
تین بھائی جناب عباسؑ کے حقیقی یعنی ام البنینؑ کے بطن سے تھے۔ عبداللہؑ، جعفرؑ، عثمانؑ، جناب عباسؑ نے ان سب کو اپنے پہلے میدانِ جنگ میں بھیجا اور کہا:

''**تقدموا بنفسی انتم فحاموا عن سیدکم حتیٰ تموتوا دونہ**''۔

''میری جان تم پر سے فدا، تم آگے بڑھو اور اپنے سیّد و سردار (حسینؑ) کی حمایت کرو۔ یہاں تک کہ ان کے قدموں پر جان نثار کر دو۔''

---

(۱) طبری، ج،۶، ص ۲۵۶۔

وہ تینوں جوان آگے بڑھے اور حسینؑ کے سامنے کھڑے ہوکر دشمنوں کے حربے روکنے لگے اور جنگ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ تینوں شہید ہوگئے۔(۱)

جب عباسؑ نے اپنے بھائیوں کو امامؑ کے سامنے شہید ہوتے دیکھ لیا۔ تب خود امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اذنِ جہاد طلب کیا۔ جناب عباسؑ یہ گوارا نہ کرسکتے تھے کہ دوسرے عزیز آپ سے پہلے میدانِ جنگ میں جا کر شہید ہو جائیں مگر آپ علمبردار تھے، آپ کو اپنی ذمہ داری کا احساس تھا اور آپ سمجھتے تھے کہ علم فوج کا نشان ہے اور وہ جب تک قائم ہے اس وقت تک وقار و عزت کا قیام ہے۔ اس لئے اب تک سب مصائب برداشت کئے تھے اور خود خاموش رہے تھے۔ مگر اب جب کہ سب شہید ہوگئے اور کوئی باقی نہ رہا تو اس وقت آپ کو حاضرِ خدمت ہونا پڑا اور عرض کیا۔ ''اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔'' حسینؑ نے بھی اجازت دی۔ کہا کہ ''تم علمدار ہو۔'' مگر عباسؑ نے عرض کیا۔ ''اب فوج کہاں ہے جس کا میں علمدار تھا۔'' اب تو بس سردار ہے اور علمدار اور یہ ظاہر ہے کہ علمدار کی حیثیت کتنی ہی اہم ہو لیکن سردار کے برابر نہیں ہے۔

یہ اطمینانِ قلب کی دلیل ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ موقع کس بات کا ہے۔ جذبات کی رو میں کوئی اقدام نہیں ہے۔ ہر ایک بات آئین کے مطابق، اصول کے موافق، کون پہلے جائے کس کے پہلے جانے میں کیا پہلو پیدا ہوتا ہے؟

سلسلۂ شہداء میں سب سے پہلے اصحاب اور عزیزوں میں سب سے پہلے علی اکبرؑ اور آخر میں جناب عباسؑ اس کے بعد فوج کا خاتمہ ہوگیا۔ پھر جو قربانیاں ہوئی ہیں وہ بے بسی کی ہیں اس طرح امام حسینؑ نے میدانِ کربلا میں تعلیمی پہلو کو مدِّ نظر رکھا۔

واقعۂ کربلا میں صرف مصائب ہی نہیں ہیں جو دلدوز ہونے کی حیثیت سے فطرتِ انسانی کو اشک افشانی کی دعوت دیتے ہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ مدرسۂ تربیت ہے جہاں دنیا کو اخلاق، ادب، فرائض شناسی کے اصول بتلائے گئے ہیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سے (جس طرح اس کے دلدوز پہلو سے اثر لیتے ہیں اسی طرح اس کی درسگاہی حیثیت سے) سبق حاصل کریں اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

★★★

---

(۱) الاخبار الطوال، ص، ۲۵۵۔